بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

نیا دستور تیسری خواندگی کے مرحلے سے گذر کر ملک کے حاکم اعلیٰ کی منظوری حاصل کر چکا ہے اور ۲۳ مارچ سے نافذ ہو جانے والا ہے۔ یہ دستور نقائص کے متعدد تشویشناک پہلو اپنے اندر رکھنے کے باوجود اس معنی میں اسلامی دستور ہے کہ اس نے تعمیر و ارتقاء کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیا ہے۔ لیکن اس رخ پر عملاً تعمیر و ارتقاء کا کام جبھی ہو گا کہ کرنے والے اسے کریں، ورنہ مجرد دستور کے الفاظ میدان میں آ کر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔ کام کرنے والے اگر دستور کے اصول و مقاصد کے مطابق کام کرنے کی نیت رکھتے ہوں تو بڑا سوال یہ سامنے آئے گا کہ سب سے پہلے کدھر سے کیا تبدیلیاں شروع کی جانی چاہئیں۔ ہم اسی سوال کو سامنے رکھ کر چند بڑی بڑی ضرورتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کسی اصولی نقشے پر ریاست اور معاشرہ کی عمارت استوار کرنا ہو تو اولین ضرورت یہ ہوتی ہے کہ عوام کے ذہن و فکر کو بدلا جائے۔ جوں جوں ذہن و فکر کی ساخت ٹھیک ہوتی جاتی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں تعمیری و اصلاحی کام سرانجام پانے لگتا ہے۔ قوم کے ذہن و فکر کو بنانے میں سب سے بڑا عامل نظامِ تعلیم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کسی نوع کے تعمیری کام کا آغاز کرنے کے لیے پہلی توجہ نظامِ تعلیم کی طرف ہوتی ہے۔ اب تک ہمارا نظامِ تعلیم ایک بے سروپا اور مجہول نقشے پر چل رہا ہے۔ وہ کوئی نصب العین نہیں دیتا کوئی نظریہ و اصول نہیں دیتا، کوئی ٹھوس کردار نہیں دیتا اور اس کے ذریعے ہم اسلامی نظامِ زندگی کے لیے تو کجا کسی بھی آزادانہ ترقی طلب معاشرے کے لیے رہنما اور کارکن حاصل نہیں کر سکتے۔ پس یہ نظامِ تعلیم اگر اپنی اسی مجہول حالت پر قائم رہے تو ہم نئے دستور کے تقاضے کسی درجے میں بھی پورے کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اسے بدلنے کے لیے پہلے بھی عام بے چینی موجود تھی مگر اب نئے دستور کے سامنے آ جانے کے بعد تو اسے موجودہ

صورت میں گوارا کرنا کھلی کھلی حماقت ہوگا۔

اب ہمارے کارپردازوں کو کسی تاخیر کے بغیر اس نظامِ تعلیم کے سامنے نئے دستور کا یہ مطالبہ رکھ دینا چاہیے کہ اس معاشرے کو آئندہ محض افسروں اور کلرکوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اچھے مسلمانوں اور اچھے انسانوں کی ضرورت ہے۔ نظامِ تعلیم کا فرض ہے کہ وہ نئی نسلوں کو اس نظریئے اور نصب العین سے مالا مال کر کے لائے جس پر ہمارا نیا دستور مبنی ہے۔ وہ ان کے دماغوں پر محض "معلومات" کے انبار لادلاد کر ان کو فارغ نہ کرتا چلا جائے بلکہ اب ان کو ایک مضبوط اسلامی کردار سے بھی آراستہ کرنے کی ذمہ داری لے۔

اس تبدیلی کے لیے سرے سے فلسفۂ تعلیم کو بدلنا ہوگا، نصاب کا نقشہ بالکل دوسرا اختیار کرنا ہوگا، معلم کے پارٹ کو بہت زیادہ وسیع کرنا ہوگا اور درسگاہوں اور ٹریننگ کالجوں کے ماحول کو نئی ساخت دینی ہوگی۔ محض اتنے سے اقدام سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ آپ دینیات کا ایک پیریڈ رکھ دیں، اور ایک کتاب مقرر کر دیں۔ تعلیم کا مقصد اور زاویۂ نظر اور اس کا مزاج بدلنے کی ضرورت ہے۔

اصلاحِ تعلیم کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری کام توسیعِ تعلیم کا ہے۔ یہ واضح ہے کہ کسی بھی نظامِ زندگی — اور خصوصاً اسلامی نظامِ زندگی — کو ایسے عوام کو ساتھ لے کر نہیں چلایا جا سکتا جو جاہل ہونے کی وجہ سے نہ اس نظامِ زندگی کے نظریے اور اس کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور نہ روزمرہ کے ملکی و بین الاقوامی حالات کو جانتے ہوں۔ پس ہماری اولین ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جلد سے جلد اپنی پوری آبادی کو کم سے کم ضروری معیار تک تعلیم یافتہ بنا دیں۔ اس کام کے لیے ایک بڑی مہم شروع کی جانی چاہیے جس میں ایک منصوبہ کے تحت سیاسی کارکن اور دفتری ملازمین، اساتذہ و طلبہ، مذہبی ادارے اور مسجدیں سب مل کر ایک ساتھ تعلیمِ بالغاں کا کام کریں۔ زیادہ سے زیادہ دس برس میں جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کے اندر ایک فرد بھی بے لکھا پڑھا نہ رہ جانا چاہیے۔

تعلیم کے مفہوم کو اگر ذرا وسیع کر کے لیا جائے تو اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہماری نئی نسلوں کی ضروریات کے مطابق کافی درسگاہیں موجود ہوں اور تعلیم بالغاں کے ادارے کام کر رہے ہوں، بلکہ اسلام کے تقاضوں

اور زندگی کے نت نئے مسائل سے پوری قوم کو آگاہ کرنے اور ادائے فرض کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھنے کے لیے پورے ریاستی ذرائع و وسائل کو متحرک کر دینا چاہیے۔

مثلاً ریڈیو کو اگر آلۂ تعیش کے بجائے ایک ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس کے ذریعے مقصدی افادیت رکھنے والی نظمیں، کہانیاں، ڈرامے، مکالمے، فیچرز، تقاریر اور تفریحی پروگرام پیش کیے جائیں تو عوام کا ذہنی و فکری معیار تیزی سے بلند کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سرکاری اہتمام سے اگر مختلف بڑے شہروں میں ایسے فری سینما کھول دیئے جائیں جن میں جوہر افادیت کے ساتھ پاکیزہ تفریحی رنگ رکھنے والے فلم پیش کیے جائیں، نیز ایسے سفری سینماؤں کے ذریعے دیہاتی آبادیوں میں کام کیا جائے تو ہم اپنے عوام کو بہت جلد ملی نصب العین، ضروری معلومات اور مضبوط کیریکٹر سے آراستہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے محکمہ ہائے تعلقاتِ عامہ اس سلسلے میں بہت ہی موثر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ وہ اپنے اہتمام سے مفید اسلامی لٹریچر اور اسلامی جرائد کی اشاعت کا انتظام کریں، اسلامی اسپرٹ رکھنے والا جو لٹریچر ملک میں شائع ہوتا ہے اس میں سے بہترین کتابوں پر سالانہ انعامات تقسیم کریں۔ اسلامی مقاصد کے لیے جو اخبارات اور جرائد تعلیم عوام کی مہم میں نمایاں حصہ لیں ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ایسی علمی مجالس کا انعقاد وقتاً فوقتاً کراتے رہیں جن میں مفید مقصد تقاریر اور مذاکرے ہوں۔ اسی طرح اگر خطیب اور واعظ حضرات کو احساس دلا کر ان کو تعمیری مقاصد کی خدمت پر متوجہ کر دیا جائے تو ان کا تعاون بہت مفید ہو سکتا ہے۔ الغرض ہر وہ سرگرمی جو ہماری اسلامی ریاست کے مطلوبہ انسان کی تیاری میں مفید حصہ ادا کرتی ہو اُسے خاص اہتمام سے ترقی دی جانی چاہیے۔

تعمیری کام کا مثبت عامل تعلیم ہے اور منفی عامل قانون۔ تدریس، لٹریچر، صحافت، پبلسٹی، تبلیغ وغیرہ سب تعلیم دینے کے طریقے ہیں اور ان کا مقصد مطلوب افکار و رجحانات کو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف قانون، عدالت، پولیس اور جیل کا پورا انتظام نامطلوب افکار و رجحانات کا انسداد کرنے میں

مصروف رہتا ہے تعلیم آدمی کو وہ کچھ بنانا چاہتی ہے جو کچھ اسے ہونا چاہیے، قانون آدمی کو وہ کچھ بننے سے روکتا ہے جو کچھ اسے نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیم دلیل سے کام لیتی ہے لیکن قانون قوت استعمال کرتا ہے۔ تعلیم وہ ضروری منفی کام نہیں کر سکتی جو قانون کرتا ہے اور قانون وہ لازمی مثبت فرض انجام نہیں دے سکتا جو تعلیم دیتی ہے۔ اس وجہ سے کسی بھی اصول اور نقشے پر تمدن کی عمارت اٹھانی ہو، ان دونوں اہم عوامل کو برابر استعمال کرنا پڑتا ہے۔

جس طرح اب تک ہمارا نظام تعلیم مجہول نقشے پر کام کر رہا ہے اسی طرح ہمارا قانونی نظام بھی نہایت بے ڈھنگا ہے۔ وہ ہماری آئیڈیالوجی، ہماری روایات، ہماری بنیادی اخلاقی اقدار اور ہمارے تمدنی مزاج سے بالکل بے تعلق ہو کر نشوونما پا رہا ہے۔ اب اگر ہم نئے دستوری فیصلوں کے مطابق اپنے سامنے ایک نظریہ اور ایک نصب العین متعین کر رہے ہیں اور اس نظریہ و نصب العین کے مطابق ہم زندگی کے ڈھانچے کو ہر پہلو سے بدلنا چاہتے ہیں تو پھر قانونی نظام کی بھی تدوین جدید ناگزیر ہے۔ جس طرز کی تبدیلی نظام تعلیم میں مطلوب ہے عین اسی کے مطابق اور اسی کے ساتھ ساتھ قانون میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ تعلیم جن رجحانات کو استوار کرنا چاہے گی، قانون کا فرض ہوگا کہ وہ ان کے مخالف رجحانات کا سدباب کرے۔ ورنہ اگر تعلیم نئے مقاصد کے لیے اپنا مثبت فرض ادا کرنا چاہے اور قانون اسی کے مطابق اپنا منفی حصہ تعمیر میں نہ لے تو سارا تعلیمی کام بھی رائگاں جائیگا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مریض کو بہترین دوائیں اور سازگار ترین غذائیں کھلاتے ہوئے اگر پرہیز نہ کرایا جا سکے تو دواؤں اور غذاؤں کا عمل اکارت جاتا ہے۔

قانون کو کتاب و سنت کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم خود دستور کا ایک جزو بن چکا ہے لیکن دستور کے اس اہم ترین جزو میں بڑے جھول اور رخنے ہیں۔ جھول اور رخنے نہ بھی ہوں تو بھی بغیر انقلابی حوصلوں کے مطلوبہ کام صحیح رفتار سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بدقسمتی سے وانستہ چھوڑے ہوئے ہر خلا اور ہر ایچ پیچ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر لیا جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہونے کا! ہاں، اگر کچھ کر دکھانے کی نیت پیدا ہو جائے تو موجودہ صورت کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ سو اگر قوم کی زندگی کو بنانا سنوارنا ہو تو قانون کی تدوین نو پوری سرگرمی سے کی جانی چاہیے۔ اس کے لیے مرکزی کمیشن کے علاوہ سرکاری اور غیر سرکاری

طور پر تحقیقی اداروں اور مجالس کی تشکیل ہونی چاہیے، اسلامی قانون پر نیا لٹریچر تیار ہونا چاہیے اور سابق علمی ذخیرے کو انگریزی اور اردو میں منتقل ہونا چاہیے اور لا کالجوں کے نصاب کو بدلنا چاہیے۔

ہمارے بے شمار معاشرتی مفاسد اور اخلاقی پستیوں کا ایک بڑا سبب موجودہ غیر اسلامی اور غیر منصفانہ معاشی نظام ہے۔ یہ روز افزوں طبقاتی تفاوت پیدا کر رہا ہے، جس کا نتیجہ طبقاتی کشمکش کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنانے والا ہے۔ اس کا یہ تباہ کن عمل آہستہ آہستہ ہمارے درمیانی طبقے کو بالکل ختم کر کے رکھ دیگا جو قومی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے بے روزگاری اور معاشی محرومی کی بلا ہمارے زیادہ سے زیادہ افراد کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ ہماری اکثریت کا حال یہ ہے کہ اسے روٹی اور کپڑے اور رہنے کے مکان اور دوا دارو کے ابتدائی مسائل اتنی فرصت ہی نہیں دیتے کہ دین و اخلاق اور قوم و ملت کے اعلیٰ تقاضوں کی طرف کچھ توجہ ہو سکے۔ انسانوں میں پیدا ہو کر ہمارے لاکھوں بھائی ڈھور ڈنگروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس گندے اور ناپاک معاشی نظام کو جوں کا توں رکھ کر اصلاح و ترقی کا کوئی معمولی سا کام بھی نہیں کیا جا سکتا، کجا کہ اسلام کے اونچے آئیڈیل کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔ لہٰذا نئے دستور کے تحت نئی زندگی کی تعمیر کا کام شروع کرتے ہوئے اس سسٹم میں جرأت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ تقاضا یہ نہیں کہ رات رات میں پورا انقلاب آجائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ دستور کے رہنما اصولوں میں معاشی اصلاح کا جو اسلامی نہج معین کیا گیا ہے اس کے مطابق جلد از جلد ضروری ابتدائی قدم اٹھائے جائیں۔ ناجائز نفع اندوزیوں، کاروباری اجارہ داریوں، ملازمین اور محنت پیشہ طبقوں کی حق تلفیوں اور موجودہ زرعی نظام کے نمایاں مفاسد کا فوری ازالہ ہونا چاہیے۔ نظام صنعت کو ابتدا ہی سے ان خطوط پر ارتقا کرنے سے روکا جائے جو مغربی سرمایہ داری نے قائم کیے ہیں اور دنیا بھر کے تجربات کو سامنے رکھ کر اپنے اصولوں کے مطابق نیا راستہ نکالا جائے۔ تعمیری پہلو سے زکوٰۃ کی تنظیم کر کے اجتماعی کفالت کا سہارا ضرورت مندوں کے لیے فراہم کیا جائے۔ فوری مقصد یہ سامنے رکھا جائے کہ پاکستان کی سرزمین پر کوئی

فرد بے کار اور بے روزگار رہنے پر مجبور نہ ہو اور کوئی فرد زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے۔

اسی طرح آگے کے وسیع تعمیری و اصلاحی منصوبوں کو سوچنے اور ہاتھ میں لینے سے قبل ملکی نظم ونسق کو صحت مند اور مضبوط بنانا بہت بڑی ضرورت ہے۔ ہماری دفتری زندگی کو بڑے بڑے روگ چمٹ گئے ہیں اور ان کی چھوت سے اوپر تلے کوئی گوشہ محفوظ نہیں رہ گیا۔ فرض ناشناسی عام ہے۔ ایک افسر اور ایک ملازم اس ذمہ داری کو سرے سے محسوس نہیں کرتا جو ریاست اور اس کے کروڑوں باشندوں کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہے بلکہ وہ ذاتی مفاد اور ذاتی خواہشات پر اپنے بڑے سے بڑے فرض کو قربان کر سکتا ہے۔ وہ وقت کی پابندی نہیں کرتا، وہ کام چوری کرتا ہے، وہ دفتر میں تضیع اوقات کرتا ہے، وہ نیچے سے رشوت لیتا اور اوپر رشوت دیتا ہے، وہ قومی مال پر ہاتھ صاف کرتا ہے، وہ "ڈیوٹی" کے نام پر ذاتی کاموں کے لیے چھٹی لیتا اور سرکاری خرچ پر نجی سفر کرتا ہے، وہ قانون اور ضابطے کے ساتھ مذاق کرتا رہتا ہے، وہ دوستوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور مخالفوں سے انتقام لینے کے لیے اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں کو ہم ایک لفظ "خیانت" کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔ "خیانت" نظم ونسق کے لیے ایک طرح کا گھن ہے۔ اگر گھن اندر ہی اندر اس سارے ڈھانچے کو چاٹ جائے جس پر مملکت کا اقتدار کھڑا ہے تو چاہے باہر کتنا ہی خوشنما رنگ و روغن موجود ہو، ہر آن تباہی کا خطرہ درپیش رہے گا۔ ایسے بودے نظم ونسق کے بل پر معاشرے کی کسی خرابی کے خلاف جدوجہد کرنا یا کسی تعمیری و اصلاحی کام کو سرانجام دینا سرے سے ناممکن ہے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ نظم ونسق کو چلانے والوں کے سامنے اوپر کی طرف سے امانت داری کی بے داغ مثال پیش کی جائے۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ان لوگوں کو نصب العین دیا جائے جس کی بلندی ان کو موجودہ پستیوں سے اوپر کھینچ لے۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ نچلے ملازمین کی تنخواہوں میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ وہ اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ چوتھی ضرورت یہ ہے کہ مغربی ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کا وہ تعیش پسندانہ نمونہ ان کی نگاہوں سے ہٹا لیا جائے جس کو کم آمدنیوں کے

ساتھ حاصل کرنے کے سلیے رشوت و خیانت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور جو کیریکٹر کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ ان تدابیر کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ خیانت اور فرض ناشناسی کے خلاف کسی قدر سختی سے انسدادی اقدامات کیے جائیں۔ نگرانی اور احتساب کو ذرا سخت کر دیا جائے اور جب کوئی واقعہ گرفت میں آجائے تو اس کی پوری تحقیقات کر کے عبرت ناک حد تک کڑی سزا دی جائے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ناگزیر ہے کہ موجودہ ضابطۂ ملازمت کو بدل دیا جائے اور اسلامی ریاست کے افسروں اور ملازمین کے بارے میں جو اصول و ضوابط قرآن اور نبی صلعم نے پیش فرمائے ہیں اور جو ہدایات خلافتِ راشدہ میں دی جاتی رہی ہیں ان کو سامنے رکھ کر نیا ضابطہ مرتب کیا جائے۔ سول سروس کا معیارِ انتخاب مقرر کرنے میں ایک شخص کی اسلامیت اور اس کے اخلاق کو پوری پوری اہمیت دی جائے اور ترقیاں دینے میں بھی اس پہلو کا لحاظ رکھا جائے۔

جب نظم و نسق اور اس کے محکمہ ہائے احتساب ٹھیک سے ادائے فرض نہ کر رہے ہوں تو وہ اس قابل نہیں رہتے کہ معاشرہ کے عام لوگوں کو خیانت سے پاک رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس دائرے میں دیکھو، ہر شخص اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ فریب اور ٹھگی کرنے میں اور ان کو لوٹ کھانے میں مصروف ہے۔ ہر معاملے میں فریب کاری، ہر چیز میں ملاوٹ، ہر کام میں چوری، ہر سودے میں دھوکا۔ یہ ہے حالت جس سے ہر شخص دوچار ہے۔ یہاں اب انتظامی مشینری اور عام پبلک کے درمیان گویا بدی کا ایک چکر چل پڑا ہے۔ اس کی خیانت اِس کو بگاڑتی ہے اور اس کی خیانت اُسے خراب کرتی ہے۔ اس چکر کو جتنا جلد ممکن ہو توڑ دینا چاہیے۔ نظم و نسق کی مشینری صحیح چال پکڑے تو پھر اس کے محکمہ ہائے احتساب پبلک کی اصلاح کرنے میں بہت مؤثر ثابت ہوں گے۔

فوری طور پر اصلاح طلب گوشوں میں سے ایک ہماری معاشرتی زندگی کا گوشہ ہے۔ اس گوشے میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری اخلاقی قدریں اور ہماری بنیادی روایات روز بروز تباہ ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارے اندر شرافت کا جیسا کچھ معیار رائج چلا آرہا تھا وہ اس لحاظ سے غنیمت تھا

کہ اس کا شعور و احساس ہمیں بے شمار اخلاقی مفاسد سے بچاتا تھا۔ ایک آدمی کا یہ خیال کرنا کہ میں مسلمان ہوں، یہ سوچنا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں، یہ احساس کرنا کہ میں ایک اعلیٰ گھرانے یا خاندان سے تعلق رکھتا ہوں بہت سے موقعوں پر اسے پستی میں گرنے سے بچا لیتا تھا۔ اس طرح کے احساسات ہماری قدروں اور ہماری روایات کے محافظ تھے لیکن کچھ مدت سے یہ احساسات مضمحل ہو رہے ہیں اور معیارِ شرافت نگاہوں سے ہٹتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں جرائم بڑھ رہے ہیں بخصوصیت سے بدکاری اور اغوا کے واقعات کی داستانیں اخبارات ہر روز ہمارے سامنے لا کے پیش کرتے ہیں۔ اوباش اور غنڈہ عناصر اور نفسیاتی مریض تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ کسی گہرے تفکر کے بغیر بھی یہ حقیقت آدمی محسوس کر لیتا ہے کہ ہمارے ہاں عورتوں میں بے پردگی و آوارہ خرامی اور مخلوط تعلیم اور مخلوط مجالس کی ریت اور نام نہاد فحش آرٹ اور فلموں کی اشاعت جس رفتار سے بڑھ رہی ہے ٹھیک اسی رفتار سے جنسی جرائم ——— اور ان کے پہلو بہ پہلو دوسرے جرائم ——— بھی ترقی کر رہے ہیں۔ گھٹیا ادب، بازاری گانے، ننگے ناچ اور شراب کے کئی شیاطین مل کر ہماری خاندانی اور ازدواجی اور اخلاقی زندگی پر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ یورپ کی بے خدا مادہ پرستانہ تہذیب کے ساتھ جس ڈھنگ کی معاشرت کھپ سکتی ہے، اس ڈھنگ کی معاشرت ایک مسلم قوم اور اسلامی ریاست کی تہذیب میں نہیں کھپ سکتی۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں اور دو متضاد چیزوں کو جب بھی جمع کیا جائے گا، نتیجہ فساد ہو گا۔

جدید مغربی معاشرت نہ صرف خدا کی محبت اور اس کے خوف کو دلوں سے نکال دیتی ہے بلکہ وہ انسان کو حیوان قرار دے کر، بلکہ اسے اجتماعی مشین کا ایک مادی پرزہ شمار کر کے انسانیت کے اس احترام کو ختم کر دیتی ہے جو آدمی اور آدمی کے درمیان ہمدردی، مواخوت کا جذباتی و اخلاقی جوڑ لگاتا ہے۔ چنانچہ اس کا اثر جہاں جہاں پہنچ رہا ہے وہاں ہر فرد دوسرے افراد سے بے نیاز ہو کر اور اپنے آپ میں مگن رہ کر ایک لایعنی قسم کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہاں تک کہ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، پڑوسی اور پڑوسی، شوہر اور بیوی کے گہرے جذباتی رشتے نہایت سطحی اور بودے ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ ہمارا نظام معاشرت والدین کی اطاعت، اقربا کی محبت، شوہر کی قوامیت، پڑوسی کے احترام، محتاجوں کی دستگیری، مظلوموں کی حمایت اور فی نفسہٖ انسانیت کی قدر شناسی کے بل پر چل سکتا ہے۔ جو معاشرت اسلام کے ان اساسی تقاضوں کو تباہ کر دے اس کے زیر سایہ آخر ایک مسلمان

ملت اپنی تعمیرِ نو کیا خاک کرسکتی ہے؟

یہ مغربی طرز کی معاشرت ایک ایسا ذہنی و عملی ماحول پیدا کرتی ہے کہ جس کے ساتھ اسلام کے تقاضے اور اصول پنپ ہی نہیں سکتے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایسے مصنوعی اور مستعار اور ناسازگار ماحول کے اندر کوئی مسلمان قوم سرے سے کسی ڈھنگ کی ترقی نہیں کرسکتی۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ مغرب کی فاسد معاشرت کی پرچھائیں قبول کرلینے کے بعد آزاد مسلمان قوموں میں سے کوئی ایک بھی درجۂ اول، بلکہ درجۂ دوم کی طاقت بننے کے قابل بھی نہیں ہوسکی۔

لہٰذا اس فاسد مغربی معاشرت کے سدِباب کی فکر کرنا ناگزیر ہے۔ اس پہلو سے کچھ نہ کچھ محسوس قسم کے اصلاحی اقدامات فوراً ہونے چاہئیں۔

تمدن و معاشرت کا لباس ہوتا ہے کلچر! اور کسی قوم کا صحیح کلچر وہ ہوتا ہے جس کے سارے مظاہر میں اس قوم کی فکر و احساس کی روح بولتی ہے۔ ہر قوم کی جداگانہ ساخت، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کی ملّی خودی کلچر کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس وقت جو کلچر ہم اپنے سانچے کے چل رہے ہیں اس میں ہمیں دوسروں کی آواز سنائی دیتی ہے، اپنی نہیں سنائی دیتی۔ اس میں دوسروں کا ذہن بولتا ہے، ہمارا اپنا ذہن نہیں بولتا۔ یہ مستعار کلچر ہماری ترجمانی نہیں کرتا۔ آج جو مجلسی آداب فروغ پا رہے ہیں، آج میل جول اور بول چال کے جو انداز پھیل رہے ہیں، آج لباس کی جو تراش خراش رائج ہو رہی ہے، ادب، تعمیرات اور دوسرے فنون کا جو مزاج بن رہا ہے اور جس اُٹھان پر ہمارا جمالیاتی ذوق اُٹھ رہا ہے، اس میں ہمارا یہ شعور بالکل نہیں بولتا کہ "ہم مسلمان ہیں"۔ اور نہ یہی احساس اس میں سے اپنی بولی سنا سکتا ہے کہ "ہم پاکستانی ہیں"۔ ہمارے کلچر میں ہمارے اعتقادات، ہمارے شعور، ہماری روایات اور ہماری اپنی تاریخ کی کوئی جھلک موجود نہیں ہے۔ گویا یہ بالکل مانگے تانگے کا ایک لباس ہے جسے ہم نے اپنے ملّی قامت پر زبردستی آراستہ کرلیا ہے۔ اس پرائے لباس کو پہن کر ہم اپنی شخصیت کے شعور سے محروم ہو رہے ہیں، اس کی وجہ سے ہمیں اپنے بارے میں مغالطہ ہو رہا ہے۔ اور بلاشبہ یہ لباس ہمیں اپنے معیارِ شرافت کے احترام سے دور ہٹا رہا ہے۔ معاشرت کی تعمیرِ نو کے لیے نہایت ضروری امر یہ ہے کہ ہم اس اجنبی کلچر سے بھی نجات پانے کی فکر کریں۔ ہمیں اپنے تمدنی مظاہر میں، چاہے وہ آداب ہوں یا فنون، نئے سرے سے بھی اسلامی

سے بنیادی تبدیلیاں کرنی ہیں۔ ہمارا کلچر وہ ہوگا جس کے ہر پہلو میں ہماری خودی کی آواز سنائی دے اور جس کے ذریعے ہم دنیا کے سامنے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کر سکیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم پاکستانی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے ہمیں اپنے "قامت پر راست کیا ہوا" اپنے ہی ذوق کا لباس مطلوب ہے۔

دوسروں سے استفادہ، دوسرے ہر میدان کی طرح، کلچر میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف اس طرح کہ اجزا میں فطری کسرِ انکسار ہو اور جو جز بھی اخذ کیا جائے وہ چھان پھٹک کر افادیت و ضرورت کی بنا پر لیا جائے اور اسے اپنے نظریے اور مزاج کے سانچے میں ڈھال کر پوری طرح اپنا لیا جائے۔ اور کلچر کا ہر وہ عنصر جو ہماری آئیڈیالوجی سے ٹکراتا ہو جو ہماری ملی روح کا ترجمان نہ ہو اسے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے۔ نہ یہ کہ سرتاپا نقل مطابق اصل تیار کر لی جائے۔

پس کلچر اور آرٹ اور آداب و اطوار کے میدان میں بھی جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت ہے۔

جس ملک کے لوگوں میں دفاعی لحاظ سے اپنی "کمزوری" کا احساس پایا جاتا ہو، وہ کسی دشمن یا دراز دست طاقت کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کریں، ان میں ایک طرح کا قومی احساس کہتری پیدا ہو جاتا ہے، وہ کسی درجے میں حالتِ خوف میں رہتے ہوں، ایسے ملک کی زندگی میں کبھی بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو قوم بھی دوسروں کے مظالم کا ہدف بنتی رہے اور کسی موقع پر جواباً مدافعتی اقدامات کافی حد تک نہ کر سکے، بلکہ محض چیخ پکار اور احتجاج کر کے رہ جاتی ہو اس کی غیرت و حمیت کا جوہر فنا ہو جاتا ہے اور پھر نہ اس کے افکار میں بلندی آ سکتی ہے، نہ اس کے کردار کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔

ایک ایسے گھر کا تصور کیجیے جس کی دیواریں پھاند کر اٹھائی گیرے دن رات ہاتھ صاف کرتے رہتے ہوں، جس کے ناموس پر غنڈے کھلے بندوں چھاپے مارتے رہتے ہوں، جس کی حدود میں راہ چلتے لوگ گھس کر بستر جما سکتے ہوں اور جس کے مالکوں میں اپنی ملکیت اور عزت کی حفاظت کرنے کی پوری پوری سکت نہ ہو اس گھر کے مکینوں میں عزت و سربلندی اور ترقی کرنے اور کوئی تعمیری مہم اٹھانے کا حوصلہ کہاں سے آئے گا۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی ملک دفاعی لحاظ سے اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگے اور اس پر آستان

حریفوں کی طرف سے دست درازیاں ہوتی رہیں تو اس کے باشندوں میں فکری و جذباتی اطمینان کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

ایک قوم اگر داخلی لحاظ سے کسی تعمیری مہم کو لے کے چلنا چاہتی ہو تو اشد ضروری ہے کہ اس کا دفاع پوری طرح مضبوط ہو، اس کے اندر قومی حمیت و خودداری کارفرما ہو۔ وہ اپنی سرحدات سے کسی غیر کے قدموں کو چھونے نہ دے اور کسی بیگانہ طاقت کو اپنی سرزمین کا ایک ذرہ اپنی جگہ سے ہلانے کا اذن نہ دے۔ کسی کو جرأت نہ ہو کہ اس کی آزادی اور اس کے حقوق کی طرف ترچھی نگاہ ڈال سکے۔ ورنہ مخالفوں اور حریفوں کے مقابلے میں ایک احساس کمتری اور ایک عالم خوف زدگی پیدا ہو جاتا ہے اور عوام بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بزدلی وہ مفسدہ ہے جو اگر ایک بار قومی زندگی میں آگھسے تو پھر کوئی تعمیر و ترقی ممکن نہیں رہتی۔ تعمیر و ترقی تو ہمیشہ بہادرانہ جذبات کے بل پر ہوتی ہے۔

پاکستان اپنی سرحدوں کے باہر کچھ حریف رکھتا ہے۔ ان کی طرف سے برابر چیرہ دستیاں ہوتی رہتی ہیں۔ گذشتہ آٹھ برس میں بے شمار ناخوش آئند حرکات ہمارے خلاف کی جا چکی ہیں۔ سرحدوں پر جھڑپیں بار بار ہوتی ہیں اور ان میں نہ صرف اغیار کی طرف سے پہل اور زیادتی ہوتی ہے بلکہ بعض جھڑپوں کے نتیجے میں کھلم کھلا ہمارے حقوق چھینے جاتے ہیں اور ہمارے قومی گھر کے کسی حصے میں جبراً آ قبضہ جمایا جاتا ہے۔ ایسے واقعات پر ایک زندہ و بیدار قوم کی حمیت جوش میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی اور دنیا میں ہمیشہ ایسی صورت میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے لیکن ایک ہم ہیں کہ احتجاجی چیخ پکار کر کے اور ناقابل اعتماد طاقتوں کے سامنے عرضی پرچہ کر کے، یا زیادہ سے زیادہ اپنے صلح پسندانہ جذبات کا واسطہ دلا کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے کسی دشمن کو گویا یہ ڈر سرے سے رہا ہی نہیں کہ اگر وہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھے گا تو ملت پاکستان اس کا سینہ چھید ڈالے گی۔

یہ درست کہ دفاع کا انحصار طاقت پر ہے اور ہم جو کچھ بھی جذبہ دشمن طاقتوں کے مقابلے میں دکھا سکتے ہیں یا دشمن طاقتیں جو کچھ بھی تاثر ہمارے بارے میں لے سکتی ہیں وہ ہماری طاقت ہی کے اندازے پر لے سکتی ہیں۔ لیکن کیا ہم طاقت کے لحاظ سے اتنے گئے گزرے ہیں کہ ہم طلسم ہیچ مقداری کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ بعض اوقات خود یہ طلسم ہیچ مقداری فراہم شدہ طاقت کو غیر مؤثر اور کم تر بنا دیتا ہے۔ علاوہ بریں طاقت سپاہیوں اور اسلحہ کی تعداد ہی کا نام نہیں ہے۔ قومی عزم و ہمت اور غیرت و حمیت خود ایک طاقت ہے جو مادی طاقت کا اثر کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ اگر ایک قوم کے افراد میں یہ داعیہ موجود ہو کہ

اگر کوئی حریف اس کے حدود یا اس کے حقوق کی طرف کوئی جارحانہ اقدام کریگا تو بوڑھے، بچے، مرد عورتیں اس کی مزاحمت کے لیے نکل کھڑے ہونگے اور گروہ در گروہ بھی اور اکیلے اکیلے بھی، اسلحہ اور سروسامان سے لد کر بھی اور نہتے ہوتے ہوئے بھی وہ مرنے مارنے کا معرکہ بپا کردیں گے تو ایسی قوم کے منہ آنا چنوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ اس اسپرٹ کو برسرِ عمل لایا جائے۔ لیکن ایسی اسپرٹ پورا پورا کام جبھی کرسکتی ہے کہ لوگوں کو اس دور کی جنگ کے فنون اور اسالیب کا علم ہو اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت رکھتے ہوں۔ افسوس ہے کہ قوم کو یہ تربیت بھی نہ دی جاسکی۔ دو ایک موقعوں پر ہنگامی طور پر ایک حرکت پیدا ہوئی تھی، لیکن پھر اوس پڑ گئی۔ اور اس وجہ سے پڑ گئی کہ عوام مسلح ہونا چاہتے تھے لیکن ان کو اسلحہ فراہم نہیں کیا جاسکا۔ کیا وجہ ہے کہ یہ ضرورت آٹھ برس میں پوری نہ ہوسکی۔ اتنی لمبی مدت میں کسی نہ کسی طرح کی شرائط پر کسی نہ کسی ملک سے معاملہ کیا جاسکتا تھا۔ بین الاقوامی حالات میں جو پلٹیاں آتی رہی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا، خارجہ پالیسی کو ایسے خطوط پر موڑا جاسکتا تھا کہ یہ ضرورت پوری ہو۔ یہ بھی نہیں تو آخر اتنی مدت میں کم از کم ہلکے اسلحہ کی ساخت کی مہم زور شور سے چلائی جاسکتی تھی۔ اس ضرورت کے لیے خود سازی کا کوئی خاص طریقہ مسلسل تجربات کرکے نکالا جاسکتا تھا۔ پچھلا وقت ضائع ہوگیا تو اب آئندہ جلد سے جلد تلافی کرنے کی فکر کی جانی چاہیے۔

لیکن قوم کو مسلح کرنے کے لیے سب سے بڑا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ حکمراں طاقت اور عوام کے درمیان محبت و اعتماد کا رشتہ قائم ہو۔ یہ رشتہ اگر کمزور ہو تو حکمراں طاقت کبھی عوام کو اسلحہ سے آراستہ نہیں کرسکتی۔ خدانخواستہ اگر اس طرح کی کوئی رکاوٹ موجود ہو تو پھر ان وجوہ کو جلد از جلد دور کرنا چاہیے جو اس رشتہ کے قیام میں حائل ہیں۔ اس رشتہ کے بغیر نہ باہر سے خیر ہوتی ہے، نہ اندر کوئی کام کیا جاسکتا ہے۔

دفاعی طاقت کو بنانے کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر جو معاہداتی روابط استوار کیے گئے ہیں، فی نفسہٖ ان کی ضرورت و اہمیت تسلیم کی جاسکتی ہے، لیکن ان روابط کے سلسلے میں جو غلط اور مضر

تاثر یہاں پیدا ہو گیا ہے وہ یہ ہے کوئی دوسری طاقت ہمارا بچاؤ کرے گی۔ یہ تاثر ایک آزاد قوم کے لیے سخت
مہلک ہے۔ زندہ وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو اپنے بارے میں خود اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہوں اور جو اپنے وجود
اور اپنی آزادی اور اپنی عزت کے بچاؤ کا انحصار کسی دوسرے پر نہ رکھیں۔ جتنا جلد ممکن ہو، اہل پاکستان کو
اُس غلط تاثر سے نکال لینا چاہیے جو غیر ملکی معاہدانہ روابط کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے۔

بہر حال زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے لازم ہے کہ دفاعی جذبہ اور دفاعی طاقت دونوں کو مستحکم کیا جائے اور
اسے اتنا حساس بنا دیا جائے کہ کسی خارجی زیادتی کو قوم چپ چاپ برداشت کرنے پر تیار نہ ہو۔

دفاع ہی کی طرح خارجی پالیسی کی مضبوطی کی ضرورت ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ہماری خارجہ پالیسی کو بار بار
ناکامی سے سابقہ پیش آیا ہے۔ بار بار ہم نے بین الاقوامی میدانِ مسابقت میں حریفوں سے زک اٹھائی ہے۔
اور کتنی ہی مرتبہ نادم ہو کر سر جھکا دینا پڑا ہے۔

ایک نوخیز ریاست کو اپنا تعارف بھی کرانا ہوتا ہے اور اپنی ساکھ بھی بالکل نئے سرے سے بنانی ہوتی
ہے۔ پھر اگر وہ نوخیز ریاست دنیا جہاں سے الگ ایک اصول و نظریہ کو لے کر اٹھی ہو تو اس کی دشواریاں
اور بھی پیچیدہ اور نازک ہو جاتی ہیں۔ اسے گہری حریفانہ چالوں اور نہایت مضر قسم کے مخالفانہ پروپیگنڈے سے
سابقہ پیش آتا ہے۔ ایسے عالم میں بڑی ذہانت اور بیدار مغزی اور مہارتِ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسئلۂ کشمیر اور انڈیا سے دوسرے جملہ تنازعات میں ہمیں شروع سے آخر تک ناکامی پیش آئی
ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی دھڑوں کے درمیان ہم نے جو موقف اختیار کیا بہت جلد محسوس ہو گیا کہ وہ
کمزور پالیسی کا مظہر ہے۔ امریکی امداد، جس کے لیے بڑی ہاؤ ہو رہی ہے، ہمارے مسائل کو حل نہ کر سکی۔
مسلمان حکومتوں کے ساتھ ہم مضبوط بنیادوں پر کوئی مستقل معاہداتی رابطہ استوار نہ کر سکے۔ اقوام کی برادری
میں اس طرح زک پر زک اٹھانے کے نتیجے میں کسی قوم کے اندر بے چارگی اور بے بسی اور نالائقی کا احساس
پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کا نتیجہ مایوسی و قنوطیت ہوتا ہے۔ آخر مایوسی و قنوطیت کے بل پر
کونسا کام کیا جا سکتا ہے۔

اب اگر خارجہ پالیسی کو از سرِ نو بنانا ہو تو اس کے لیے حسب ذیل بنیادیں اختیار کرنی چاہئیں:-

۱- دوسری قوموں اور طاقتوں کی حمایت و سرپرستی کی مقابلے میں اپنے عوام کے جذبۂ تعاون کو زیادہ اہمیت دی جائے اور بین الاقوامی معاملات و روابط کے لیے ہر مرحلے پر رائے عام کو بیدار کیا جائے اور ساتھ لیا جائے۔

۲- دنیا کی کسی بھی طاقت کو بالکلیہ اپنی باگ ڈور نہ تھما دی جائے اور نہ کسی پر اندھا اعتماد کر کے بُرا بھلا اس پر چھوڑا جائے۔

۳- خارجہ پالیسی میں خودداریٔ ملت کی اسپرٹ کو پوری طرح برقرار رکھا جائے اور اپنی مجبوریوں کا غیر معمولی حد تک ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر بھکاریوں کی سی پوزیشن اختیار نہ کی جائے؛ نہ ہی یہ مناسب ہے کہ ضرورت سے زیادہ دباؤ کے تحت گر گر کر معاملات کیے جائیں۔ اہتمام کیا جائے کہ پاکستان کسی کا آلۂ کار بن کے استعمال نہ ہونے لگے اور پرائے شگون کے لیے اپنی ناک نہ کٹواتا پھرے۔

۴- تمام غیر ملکی روابط اور معاملات میں قوم کی نمائندگی کا ذریعہ ایسے ذہین لوگوں کو بنایا جائے جو اپنی آئیڈیالوجی اور اپنے کلچر اور اپنے مفاد کے سچے ترجمان ہوں۔ سفارتی مناصب کو سیاسی سوداباز یوں کی متاع نہ بنایا جائے۔

۵- خارجہ پالیسی بنانے میں ہمیشہ اپنی آزادی اور اپنے نصب العین کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

مناسب ہوگا کہ اس طرح کی ضروری تبدیلیوں کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جائے اور ہر شعبہ کے لیے تبدیلی کا منصوبہ بنانے کا کام ماہرین کے ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے۔ تعمیر و اصلاح کے پورے کام کو زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت پر پھیلا کر اسے دو ضمنی پنج سالہ منصوبوں میں بانٹ دیا جائے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے کام کو سال وار تقسیم کیا جائے اور تعینی نقشہ سامنے آ جائے کہ ۱۹۵۶ء میں اتنا اتنا کام فلاں فلاں شعبے میں کر لیا جانا ہے، اتنا ۵۷ء میں اور اتنا اتنا آئندہ سالوں میں۔ اس طرح کا نقشۂ عمل اگر پورے عزم کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ دیا جائے

تو عام لوگوں میں بھی عملی اسپرٹ بیدار ہوگی اور وہ محسوس کریں گے کہ اب فی الواقع کام ہونے لگا ہے۔

خریدارانِ ترجمان القرآن سے ضروری گذارشات

(۱) کم از کم پانچ پرچوں پر ایجنسی دی جاتی ہے۔

(۲) پرچہ ایجنسی ہر ماہ وی پی ارسال کیا جاتا ہے۔

(۳) ۵ سے ۴۹ پرچوں پر پچیس فی صد کمیشن، پچاس سے چوہتر پرچوں پر ۳۰ فی صد کمیشن اور پچہتر سے زائد پر جتنے بھی منگوائے جائیں تینتیس فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔

(۴) ڈاک خرچ بذمہ دفتر ہوتا ہے۔

(۵) اگر کوئی صاحب پرچہ ایجنسی واپس کر دیں اور پھر وہی پرچہ دوبارہ منگوائیں تو ڈاک خرچ ایجنٹ کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ رسالہ ترجمان القرآن کے پرانے خریداروں سے گذارش ہے کہ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مکمل پتہ اور نمبر خریداری صاف تحریر فرمایا کریں۔

اگر کوئی صاحب نئے خریدار بننا چاہیں تو منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مکمل پتہ تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمائیں کہ میں نیا خریدار ہوں اور فلاں ماہ سے پرچہ جاری کیا جائے خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت بھی پتہ اور نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔ اگر پتہ بدلنا ہو تو پرانا پتہ، نیا پتہ اور نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔ ورنہ اس کے بغیر تعمیل مشکل ہوگی۔

محمد نافع الدین

دفتر ترجمان القرآن